

اسلامی تہذیب اس کے اصول و مبادی

(۱۴)

ایمان ۵ ایمان بالیوم الآخر

یوم آخر سے مراد موت کے بعد کی زندگی ہے۔ اسی لئے اس کو حیات آخرت، اور دار آخرت بھی کہا گیا ہے۔ قرآن مجید کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جو اس دوسری زندگی کے دگر سے خالی ہو۔ طرح طرح سے اس کو ذہن نشین کیا گیا ہے، اس کی صداقت پر دلائل قائم کئے گئے ہیں، اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اس کی اہمیت بتائی گئی ہے، اس پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے، اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو شخص اس اخروی زندگی پر ایمان نہیں لاتا اس کے اعمال غارت ہو جاتے ہیں وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أُعْمَالُهُمْ (۱۷: ۱۷) اور قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا اللَّهُ (۱۷: ۱۷)۔ حیات اخروی کا اعتقاد جس کو اس شد و مد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، بعض ایسے سوالات کا جواب ہے جو فطری طور پر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

چند فطری سوالات | انسان خوشی سے زیادہ غم اور راحت سے زیادہ تکلیف و مصیبت کو محسوس کرتا ہے۔ اور یہ کچھ فطری بات ہے کہ جو چیز انسان کے حیات کو جتنی زیادہ بھیس لگاتی ہے، وہ اتنی ہی زیادہ اس کی قوت فکر و حرکت میں لاتی ہے۔ جب کوئی چیز ہم کو محال ہوتی ہے تو اس کی خوشی میں ہم یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ یہ کہاں سے آئی؟ کیونکر آئی؟ اور کب تک چلے گی؟ لیکن جب کوئی شے ہم سے کھوئی جاتی ہے تو اس کا صدمہ ہمارے دلوں میں گہرا ایک تار یا زنا لگا دیتا ہے، اور ہم سوچتے لگتے ہیں کہ یہ کیسے کھوئی گئی؟ کہاں گئی؟

اب کہاں ہوگی؟ اور کیا یہ ہیں کبھی پھر حاصل ہوگی یا نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ زندگی اور اس کے آغاز کا سوال ہمارے لئے اتنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہمیت موت اور اس کے انجام کے سوال کو حاصل ہے۔ اگرچہ دنیا کی اس تماشا گاہ اور اس میں خود اپنے وجود کو دیکھ کر ہمارے دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ کیسا منگام ہے؟ کیسے شروع ہو گیا؟ کس نے برپا کر دیا؟ لیکن یہ سب فرصت کی باتیں ہیں، اور گہری فکر رکھنے والے خواص کو چھوڑ کر عام انسان ان سوالات میں کم الجھتے ہیں بخلاف اس کے موت اور اس کی بلخوں سے ہر شخص کو دوچار ہونا پڑتا ہے، ہر شخص کی زندگی میں بہت سے موقع ایسے آتے ہیں جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیزوں، دوستوں اور پیاروں کو مرتے دیکھتا ہے۔ عیس اور کمزور بھی مرتے ہیں، طاقت اور مہمیت والے بھی مرتے ہیں، حسرتناک موتیں بھی واقع ہوتی ہیں، عبرتناک موتیں بھی پیش آتی ہیں، اور آخر میں ہر شخص کو خود اسی راہ پر اپنے گزرنے کا یقین ہوتا ہے جس پر سب گزرے ہیں۔ ان مناظر کو دیکھ کر شاید ہی کوئی انسان دنیا میں ایسا ہو جس کے دل میں موت کے سوال نے ایک الجھن پیدا نہ کی ہو، اور جس نے اس امر پر غور نہ کیا ہو کہ یہ موت کیا ہے؟ انسان اس دروازے سے گزر کر آخر کہاں چلا جاتا ہے؟ اور اس دروازے کے پیچھے کیا ہے؟ بلکہ کچھ ہے بھی یا نہیں؟

یہ تو ایک عالم سوال ہے جس پر عوام اور خواص سب نے غور کیا ہے۔ ایک معمولی کسان سے لیکر ایک بڑے بڑے فلسفی اور حکیم تک سب ہی اس میں الجھتے ہیں لیکن اسی ضمن میں بعض اور سوالات بھی ہیں جو قریب قریب ہر صاحب فکر آدمی کے دل میں کھٹکتے ہیں۔ اور زندگی کے بہت سے تلخ واقعات اس کھٹک کو اور زیادہ بڑھا دیتے ہیں۔ یہ چند برس کی زندگی جو ہم میں سے ہر شخص کو اس دنیا میں ملتی ہے ہر لمحہ اور ہر آن کسی نہ کسی کام، کسی نہ کسی سعی اور کسی نہ کسی حرکت میں بسر ہوتی ہے جس کو ہم سکون سمجھتے ہیں وہ بھی ایک حرکت ہے جس کو ہم بیکاری خیال کرتے ہیں وہ بھی ایک کام ہے۔ ان میں سے ہر فعل کا رد فعل، ہر حرکت کی بازگشت، ہر گوش کا ثمرہ اور ہر سعی کا انجام ضرور ہونا چاہئے۔ نیکی کا پھل نیک اور بدی کا پھل بُرا ملنا لازم ہے۔ اچھی گوش کا

اچھا نتیجہ اور بری کوشش کا برا نتیجہ ظاہر ہونا ضروری ہے، مگر کیا ہماری تمام کوششوں کے نتائج، تمام معنی کے ثمرات، تمام افعال کے جواب ہماری اس زندگی میں ہم کو مل جاتے ہیں؟ ایک بدکار نے تمام عمر شرارتوں میں گزاری، بعض شرارتوں کا پھل بلاشبہ اس کو دنیا میں مل گیا، کسی شرارت نے اسے بیماری میں مبتلا کر دیا، کسی شرارت نے اس کو تکلیفوں اور مصیبتوں اور پریشانیوں میں پھنسا دیا۔ مگر بہت سی شرارتیں ایسی بھی تو رہ گئیں جن کا پورا پورا بدلہ اس کو دنیا میں نہ ملا۔ بہت سی شرارتیں ایسی ڈھکی چھپی رہیں کہ ان کی وجہ سے اس کی بدنامی اور رسوائی تک نہ ہوئی۔ اور اگر بالفرض بدنامی ہوئی بھی تو جس غریب پر اس نے ظلم کیا تھا اس کے نقصان کی کونسی تلافی ہوئی؟ پھر کیا اس شریک کے ظلم، اور مظلوموں کے صبر سب کے لیے نتیجہ ہی ہیں گے؟ کیا ان کا کوئی انجام کبھی ظاہر ہی نہ ہوگا؟ یہی حال نیکیوں کا بھی ہے، بہت سے نیک انسان عمر بھر نیکی کرتے رہے، اور ان کا پورا پورا ثمرہ انھیں دنیا میں نہ ملا، بعض نیکیوں پر ان کی الٹی بدنامی اور رسوائی ہوئی۔ بعض نیکیوں پر وہ ستائے گئے، بعض نیکیوں پر انہیں سزا میں ملیں، بعض نیکیوں کا حال کبھی نیا پر کھلا ہی نہیں۔ پھر کیا ان غریبوں کی سب نیکیاں اکارت گئیں؟ کیا اتنی سخت معفتوں اور کوششوں کا ثمرہ اتنا ہی ثمرہ کافی ہے کہ انہیں ضمیر کا اطمینان نصیب ہو گیا؟

یہ سوال تو صرف اشخاص اور افراد سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے بعد ایک اور سوال انواع اور اجناس اور عناصر اور اس تمام عالم کے انجام سے بھی تعلق رکھتا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی مرنے میں اور ان کی جگہ دوسرے پیدا ہو جاتے ہیں۔ درخت اور جانور سب فنا ہوتے ہیں۔ اور ان کی جگہ دوسرے درخت اور جانور پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر کیا مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہیگا؟ کیا کہیں پہنچ کر یہ ختم نہ ہوگا؟ یہ ہوا، یہ پانی، یہ زمین، یہ روشنی، یہ حرارت، اور یہ قدرتی طاقتیں جن کے قہر کا رخا نہ عالم ایک خاص ڈھنگ پر چل رہا ہے، کیا یہ سب لازوال ہیں؟ کیا ان کے لئے کوئی عمر مقرر نہیں ہے؟ کیا ان کے نظم اور ان کی ترتیب میں کبھی کوئی تغیر واقع نہ ہوگا؟

اسلام نے ان تمام سوالات کو حل کیا ہے، اور حیات اخروی کا اعتقاد و دراصل ان ہی سوالات کا جواب ہے۔ لیکن اس حل اور اس کی صداقت اور اس کے اخلاقی و تمدنی نتائج پر بحث کرنے سے پہلے رکھنا چاہیے کہ خود انسان نے ان سوالات کو حل کرنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ کس حد تک کامیاب ہیں؟

حیات اخروی کا انکار ایک جماعت کہتی ہے کہ زندگی جو کچھ بھی ہے یہی دنیا کی زندگی ہے، اور موت کے معنی بالکل فنا اور معدوم ہو جانے کے ہیں جس کے بعد حیات، شعور، احساس، پھل اور نتائج کچھ بھی نہیں۔ ان کا قول ہے: **لَا يَمُوتُونَ** اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتُنَا الْاُولٰٓئِ وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِّينَ (۴۴: ۲) و قَالَ لَوْ مَا هِيَ اِلَّا حَيٰوُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يَهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (۴۵: ۳) بخلاف اس کے یہ کارخانہ عالم جس طرح چل رہا ہے یونہی چلتا رہے گا۔ اس نظام میں ایسی پائیداری ہے کہ کبھی درجہ بچہ ہونے والا نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ اس بنا پر نہیں کہتے کہ ان کو کسی ذریعہ علم سے تحقیق ایسا معلوم ہو گیا ہے کہ فی الواقع موت کے بعد کچھ نہیں ہے، اور فی الواقع یہ کارخانہ عالم لازماً ال ہے بلکہ دراصل انہوں نے محض اپنے حواس پر اعتماد کیا ہے، اور یہ رائے اس لئے قائم کی ہے کہ موت کے بعد کی کوئی کیفیت ان کو محسوس نہیں ہوئی، اور نظام عالم کی برہمی کے کوئی آثار انہوں نے نہیں دیکھے مگر کیا ہمارا کسی شے کو محسوس نہ کرنا اس کے انکار کے لئے کافی دلیل ہے؟ کیا ہمارا احساس ہی دراصل اشیا کا وجود اور ہمارا عدم احساس ہی اشیا کا عدم ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جو چیز جس وقت میرے احساس میں آتی ہے، وہ دراصل اسی وقت وجود میں آتی ہے، اور جب وہ میرے حواس سے غائب ہو جاتی ہے تو وہ دراصل فنا ہو جاتی ہے۔ میں نے جس دریا کو بہتے دیکھا تھا وہ اسی وقت پیدا ہوا جب میں نے اسے بہتے دیکھا اور جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو معدوم ہو گیا۔ کیا کوئی صاحب عقل آدمی میرے اس قول کو صحیح مان لے گا؟ اگر نہیں تو کوئی صاحب عقل آدمی اس قول کو کیسے صحیح مان سکتا ہے کہ موت کے بعد کی کیفیت جو نچہ ہم کو معلوم نہیں اس لئے موت کے بعد سرے سے کوئی کیفیت ہی نہیں ہے۔

پھر جس موت اور فنا کے متعلق محض جو اس پر بھروسہ کر کے حکم لگانا غلط ہے، اسی طرح زندگی اور بقا کے متعلق بھی جو احکام محض جو اس کے بل پر لگائے جاتے ہیں، ان کا کچھ اعتبار نہیں۔ اگر کارخانہ عالم کے دائمی اور لازوال ہونے کا حکم محض اس بنا پر لگانا درست ہے کہ ہم نے اس کو درہم برہم ہوتے نہیں دیکھا، تو میں بھی ایک مضبوط عمارت کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی کیونکہ میں نے نہ اس کو گرتے دیکھا، اور نہ اس میں کوئی بوسیدگی مجھے نظر آتی ہے جو اس کے کبھی آئندہ گرنے کی پیش گوئی کرتی ہو کیا میرا استدلال

ارباب عقل کی بارگاہ میں مقبول ہوگا؟

اخلاق پر انکار آخرت اثر | فلاسفہ اور حکما راب قریب قریب اس خیال پر متفق ہو چکے ہیں کہ ایک نہ ایک دن نظام عالم ضرور درہم برہم ہوگا۔ عالم کی ازلیت اور عبدیت کے قدیم فلسفیانہ نظریہ کو دہرانے والا شاید آج اہل علم کی جماعت میں کوئی بھی نہیں ہے۔ تاہم ابھی تک موت کو فنا کے محض کہنے والے بہت باقی ہیں اور ان کے اس قول کی بنا وہی غیر معقول بات ہے جو ابھی اوپر بیان ہوئی۔ لیکن اس کی غیر معقولیت سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قول سے انسان کو کبھی تسلی حاصل نہیں ہو سکتی اور بہت سے وہ سوالات جو زندگی کے معاملات کو دیکھ کر دل میں پیدا ہوتے ہیں، اس قول میں تشنہ جواب ہی رہ جاتے ہیں۔ علاوہ برین اگر انسان کے اخلاق اور اس کی سیرت کی تمیز اس اعتقاد پر قائم ہو، تو یقیناً وہ دو حال سے خالی نہ ہوگی۔ ناموافق حالات میں اس سے شدید قسم کی مایوسی اور پست ہمتی انسان پر طاری ہوگی کیونکہ جب وہ اپنی نحوکاری کا کوئی نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتے نہ دیکھے گا۔ تو اس کی قوت عمل سرد پڑ جائیگی جبکہ اپنی مطلوبی کی وادری کا کوئی ذریعہ دنیا میں نہ پائے گا تو اس کا دل ٹوٹ جائیگا۔ اور جب وہ شریروں بدکاروں اور ظالموں کو دیکھا۔ پھلتے پھولتے دیکھیگا تو خیال کرے گا کہ عالم تہی میں شری کا بول بالا ہے اور خیر صرف نیچا ہی دیکھنے کے لئے ہے۔

مخلاف اس کے اگر حالات موافق ہوں تو اس اعتقاد کے اثر سے انسان ایک نفس پرست جو ان بن حایکا۔ وہ خیال کرے گا کہ زندگی کے جو دن عیش اور لطفہ میں بسر ہو جائیں پس وہی غنیمت ہیں۔

اگر دنیا کی کسی لذت اور کسی لطافت سے محروم رہ گئے تو پھر کوئی زندگی نہیں جس میں اس کی کسپوری ہو وہ ظلم و ستم کر سکیا لوگوں کے حقوق غصب کرے گا، اپنے فائدے اور اپنے نفس کی خواہشات کے لئے کوئی بدتر سے بدتر فعل کرنے میں بھی اس کو باک نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ نیکی اور شرافت جو ایسے شخص کے تصور میں آسکتی ہے وہ بس وہی ہے جس کے اظہار سے نیک نامی، شہرت، عزت، یا اور کسی قسم کے دنیوی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ صرف ایسے ہی جو انہم کو جو انہم اور ایسے ہی گناہوں کو گناہ سمجھے گا جن کا نتیجہ کسی دنیوی سزا یا جسمانی عقوبت یا مادی نقصان کی شکل میں ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو رہا ہے وہ نیکیاں جن کا کوئی نفع اس دنیا میں ظاہر ہونے والا نہ ہو، تو وہ اس کے نزدیک حماقت سے کم نہ ہونگی۔ اور وہ برائیاں جن کا کوئی نقصان اس دنیا میں عائد ہونے والا نہ ہو، تو وہ اس کے نزدیک عین صواب ہوں گی۔

اگر کہیں پوری سوسائٹی کا نظام اخلاق اسی اعتقاد اور اسی ذہنیت پر قائم ہو، تو سرے سے اس کے اخلاقی تصورات ہی بدل جائیں گے۔ اس کا پورا نظام اخلاق خود غرضی اور نفسانیت کی بنیاد پر تعمیر ہو گا۔ نیکی محض دنیوی فائدہ کی ہم معنی ہوگی اور بدی محض دنیوی نقصان کی مترادف ہو کر رہ جائیگی۔ جھوٹ اگر دنیا میں نقصان کا موجب ہو تو گناہ ہوگا، اور فائدہ کا ذریعہ ہو تو عین صواب بن جائے گا۔ صداقت اگر دنیا میں جلب منفعت کا ذریعہ ہو تو نیکی ہوگی، ورنہ بصورت نقصان اس سے بڑھ کر کوئی بدی نہ ہوگی۔ زنا لذت اور عیش کے لئے مستحسن ہوگی، اور اس میں برائی کا پہلو اگر کبھی پیدا ہوگا بھی تو صرف اس وقت جبکہ وہ صحت کے لئے موجب نقصان ہو۔ غرض جہاں اس دنیوی زندگی سے آگے کسی اچھے یا بُرے نتیجے کے مترتب ہونے کا خوف یا امید نہ ہو، وہاں انسان افعال کے صرف انہی نتائج پر نظر رکھے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہونے والے ہیں، اور اس سے اعمال کی اخلاقی قدروں میں ایسا تغیر واقع ہو جائیگا۔ جو ہرگز کسی جہذب انسانی سوسائٹی کے لئے سازگار نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایسے اخلاقی معیاروں کے ساتھ کوئی انسانی گردہ جانوروں سے بھی زیادہ بدتر و رجہ تک گرا رہے۔

نہیں رہ سکتا۔

آپ کہیں گے کہ سزا اور جزا کے لئے دنیا میں صرف مادی و جسمانی نقصانات اور فوائد ہی نہیں ہیں بلکہ خود انسان کے اندر بھی ایک قوت موجود ہے جس کا نام ”ضمیر“ ہے۔ اس کی ملائیں اور اس کی بے اطمینانی اس دنیا میں بدی کے لئے کافی سزا ہیں۔ اور اس کا اطمینان انسان کے لئے نیکی کا کافی معاوضہ ہے لیکن اول تو بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کے مادی فوائد انسان کو ضمیر کی سرزنش برداشت کرنے کے لئے آمادہ کر دیتے ہیں اور بہت سی نیکیوں کے لئے انسان کو اتنی قربانی کرنی پڑتی ہے کہ محض ضمیر کا اطمینان ان کا پورا معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اگر آپ ضمیر کی حقیقت پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کا کام اخلاقی تصورات پیدا کرنا نہیں ہے، بلکہ جو اخلاقی تصورات ایک خاص قسم کی تعلیم و تربیت سے انسان کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں انہی کی تائید اس کا ضمیر کرنے لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک ہندو کا ضمیر جن باتوں پر سرزنش کرتا ہے، ایک مسلمان کا ضمیر ان پر سرزنش نہیں کرتا پس اگر کسی سوسائٹی کے اخلاقی تصورات بدل جائیں اور خیر و شر کے معیار متغیر ہو جائیں تو ان کے ساتھ ساتھ ضمیر کا رخ بھی پھرنے لگتا ہے اور وہ ان افعال پر سرزنش کرے گا جن کو اب اس سوسائٹی نے گناہ سمجھنا چھوڑ دیا ہے، اور نہ ان افعال میں اطمینان محسوس کرے گا جن کو اب یہ سوسائٹی نیکی ہی نہیں سمجھتی۔

نظریہ تناسخ | دوسری جماعت وہ ہے جس نے تناسخ کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے

کہ موت کے معنی فنا ہے جس کے نہیں ہیں بلکہ محض تبدیل جسم کے ہیں۔ روح اس جسم سے مفارقت کرنے کے بعد کوئی دوسرا جسم اختیار کرتی ہے، اور وہ دوسرا جسم یا زیادہ صحیح الفاظ میں دوسرا قالب اس قابلیت کی مناسبت سے ہوتا ہے جو انسان نے اپنی پہلی زندگی میں اپنے اعمال اور اپنے رجحانات سے بہم پہنچائی ہے۔ اگر اس کے اعمال بُرے رہے ہیں اور ان کے اثر سے اس کے نفس میں بُری قابلیتیں پیدا ہو گئی ہیں تو اس کی رجحان ادنیٰ درجہ سے حیوانی یا نباتی طبقات میں چلی جائے گی، اور اگر اچھے اعمال سے اچھی قابلیتیں

اس نے بہم پہنچائی ہیں تو روح اعلیٰ طباقوں کی طرف ترقی کرے گی۔ غرض اس نظریہ کی رو سے جزا اور سزا جو کچھ بھی ہے اس دنیا اور انہی اجسام کے عالم میں ہے۔ ارواح بار بار اسی دنیا میں قالب بدل بدل کر آتی ہیں تاکہ اپنے پچھلے اعمال کے نتائج بھگتیں۔

یہ نظریہ ایک زمانہ میں بہت مقبول رہا ہے یونان میں مسیح سے کئی صدی قبل فیتاغورس اور انہزقلس (Heraclitus) وغیرہ اس کے قائل تھے، روم میں بھی سبیت سے پہلے اس کا چرچا تھا، مصر کی قدیم تاریخ میں بھی اس کے کچھ آثار پائے جاتے ہیں۔ یہودیوں میں بھی بیرونی اثرات سے تنازع کا عقیدہ داخل ہو گیا تھا، لیکن اب یہ اعتقاد یا تو ہندی الاصل مذاہب دبرہنیت، بودھ مت، جین مت وغیرہ میں پایا جاتا ہے، یا پھر مغربی افریقہ، جنوبی افریقہ، مدغاسکر، وسطی ایشیاء، انڈونیشیا، اوشیانیا، شمالی و جنوبی امریکہ وغیرہ کی وحشی یا نیم وحشی قوموں میں۔ باقی تمام مذاہب تو ہیں اس کو رد و کچلی ہیں، کیونکہ انسان نے اب تک علم و عقل کی ترقی سے دنیا اور اس کی زندگی کے متعلق جس قدر واقفیت بہم پہنچائی ہے وہ ان تمام نظریات کی تردید کرتی ہے جنہیں نظریہ تنازع کی بنا قائم ہے۔ خود ہندی الاصل مذاہب میں بھی حیم کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو بہم معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ویدک مہندوستان میں پچھلے سرے سے موجود ہی نہ تھا اس زمانہ کے آریوں کا عقیدہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد انسان کو ایک دوسری زندگی ملتی ہے جو نیکو کاروں کے لئے بہتر اور بدکاروں کے لئے سزا ہے اس کے بعد دفعہ اس نظریہ میں تنبیہ واقع ہوتا ہے، اور دوسرے دور کے ہندو لٹریچر میں ہم کو وہ کتابیں ملتی ہیں جن میں تنازع کا نظریہ ایک فلسفیانہ اعتقاد کی شکل میں پایا جاتا ہے اس تغیر کا سبب ابھی تک محقق نہیں ہو سکا ہے بعض محققین کا خیال ہے کہ پچھلے آریوں میں قدیم ڈراوید قوموں سے آیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ خود آریوں کے ادنیٰ طباقوں میں موجود تھا، اور انہی سے بعد کے برہمن فلسفیوں نے اس کو لیکر تخیلات اور قیاسات کی ایک پوری عمارت اس پر قائم کر دی۔ اسی طرح بودھ مذہب بھی ابتداً تنازع کی اس مفصل ایکم سے خالی تھا جو بعد کے بودھی لٹریچر میں پائی جاتی

ہے۔ جہاں تک قدیم لٹریچر سے تہ چلتا ہے، ابتداء میں بودھ و ہرم کا نظریہ یہ تھا کہ وجود ایک دریا ہے جو مسلسل تغیر اور انقلاب کی شان سے بہتا چلا جا رہا ہے۔ اسی تخیل نے آگے چل کر یہ صورت اختیار کی کہ تمام عالم کی ایک ہی روح اور تمام عالم میں ایک ہی وجود ہے جو صورتوں پر صورتیں اور قالب پر قالب بدلتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابتداء میں وحی و الہام کے سرچشمے سے منہدی قوموں کو جو علم حاصل ہوا تھا، اس کو انہوں نے بدل کر ایک ایسا فلسفیانہ مذہب ایجاد کر لیا جو محض ان کی اپنی اچھ کا نتیجہ تھا۔

عقلی تنقید یہاں تنازع کے مسئلہ پر کسی مفصل بحث کی گنجائش نہیں ہے مگر اس کی غلطی واضح کرنے کے لئے اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ عقیدہ تنازع کی بنیاد ایسے نظریات پر جو صریح عقل کے خلاف ہیں اور ان تمام علوم کے منافی ہیں جو اب تک انسان کی دنیا اور اس کی زندگی پر غور و خوض کرنے سے حاصل ہوئے ہیں۔ اہل تنازع کا خیال ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا نتیجہ اسی دنیا میں اس طرح ملتا ہے کہ وہ اپنے اچھے اعمال کی بدولت زندگی کے اعلیٰ طبقات کی طرف صعود کرتا ہے اور برے اعمال کی بدولت ادنیٰ طبقات کی طرف اتر جاتا ہے۔ مثلاً اگر انسان نے اس زندگی میں بُرے عمل کئے تو وہ حیوانی اور نباتی طبقات کی طرف نزول کر گیا۔ اور اگر حیوان نے اپنی زندگی میں اچھے عمل کئے تو وہ انسانی طبقات کی طرف صعود کرے گا۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ حیوانی اور نباتی زندگی نتیجہ ہے انسانی زندگی کے بُرے اعمال کا اور انسانی زندگی نتیجہ ہے نباتی اور حیوانی زندگی کے اچھے اعمال کا۔ یا بالفاظ دیگر اس وقت جو انسان ہیں وہ اس لئے انسان ہیں کہ پہلے انہوں نے نباتی اور حیوانی زندگی میں اچھے اعمال کئے تھے۔ اور اس وقت جو نباتات اور حیوانات ہیں وہ اس لئے ہیں کہ انہوں نے انسانی زندگی میں بُرے اعمال کئے تھے۔ اس نظریہ کو ماننے کے لئے چند اور باتوں کا ماننا ضروری ہے۔ اور وہ سب علم و عقل کے خلاف ہیں۔ مثلاً

۱۔ تنازع کا یہ حل کیا ہے جس کا کوئی آغاز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ انسان ہونے کے لیے لازم ہے کہ اس سے پہلے نبات اور حیوان ہو اور نبات اور حیوان ہونے کے لیے لازم ہے کہ ان سے پہلے انسان ہو۔ یہ کھلا ہوا دوسرا ہے جس کو عقل محال قرار دیتی ہے۔

۲۔ اگر تنازع کا حل لازمی اور ابدی ہے تو ماننا پڑے گا کہ نہ صرف وہ ارواح جو بار بار قالب بدلتی ہیں بلکہ وہ مادے بھی جو ان ارواح کو قالب مہیا کرتے ہیں لازمی اور ابدی ہوں، اور یہ زمین اور یہ نظام شمسی اور یہ قوتیں جو اس نظام میں کام کر رہی ہیں، یہ سب بھی لازمی اور ابدی ہوں لیکن عقل کا دعویٰ ہے اور علمی تحقیقات اس پر شہادت دیتی ہے کہ ہمارا نظام شمسی نہ لازمی ہے اور نہ ابدی۔

۳۔ ماننا پڑے گا کہ نباتات حیوانات اور نوع بشری کی جتنی امتیازی خصوصیات ہیں وہ سب دراصل ان کے اجسام کے خاصے ہیں نہ کہ نفوس کے۔ اس لئے کہ نفوس انسان کے قالب میں عقل و فکر کی قوتیں رکھتا تھا، وہ حیوان کے قالب میں پنچر لا عقل ہو گیا۔ اور نباتی قالب میں پنچر اس غریبے حرکت ارادی کی قوت بھی سلب ہو گئی۔

۴۔ نیک اور بد کا اطلاق دراصل ان اعمال پر ہوتا ہے جو سوچ سمجھ کر بالا ارادہ کئے جائیں اس لحاظ سے انسان کے اعمال تو نیک اور بد ہو سکتے ہیں اور ان پر جزا و سزا مرتب ہو سکتی ہے لیکن نباتات اور حیوانات کے اعمال پر نہ تو نیکی اور بدی کا اطلاق جائز ہے، اور نہ ان پر جزا و سزا مرتب ہونے کی کوئی معقول وجہ ہے۔ ایسا حکم لگانے کے لئے یہ ماننا ضروری ہوگا کہ نباتات اور حیوانات میں بھی سوچ سمجھ کر بالا ارادہ فعل کرنے کی قوت ہے۔

۵۔ اگر بعد کی زندگی ہمارے موجودہ جہنم کے کرموں کا پھل ہے تو ظاہر ہے کہ بڑے کرموں کا پھل بڑا ہی ہونا چاہئے۔ اور جب وہ دوسرے جہنم میں وہ بڑا پھل ہم کو ملتا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس بڑے پھل سے نیک اعمال صادر ہوں؟ لا محالہ اس سے بڑے ہی اعمال صادر ہوں گے، اور پھر ان کا پھل

تیسرے جنم میں اور بھی زیادہ برا ہوگا۔ اس طرح بدکار انسان کی روح تناسخ کے چکر میں نیچے اور نیچے طویل ہی کی طرف گرتی چلی جائے گی۔ اس کے پھر ابھر کر آنے کی کبھی توقع نہیں کی جاسکتی۔

تمدن عقیدہ تناسخ کا اثر | ان کے علاوہ اور بہت سے وجوہ ہیں جن کی بنا پر عقل سلیم تناسخ کے اعتقاد کو قبول نہیں کر سکتی یہی وجہ ہے کہ انسان عقل اور علم میں جتنی جتنی ترقی کرتا گیا، تناسخ کا اعتقاد باطل ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ اب وہ زیادہ تر ان قوموں میں باقی رہ گیا ہے جو عقلی اور علمی ترقی میں بہت پسماندہ ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تناسخ کا اعتقاد ہمتوں کو پست کرنے والا، اور ترقی کی روح کو مردہ کرنے والا اعتقاد ہے۔ اسی اعتقاد سے ”اھنسا“ کا عقیدہ نکلا ہے جو انسان کی شخصی اور قومی زندگی کے لئے حد درجہ مہلک ہے۔ جو قوم اس عقیدہ کی قائل ہو اس کی جنگی اسپرٹ فنا ہو جاتی ہے۔ اس کی جسمانی قوتیں مضحل ہو جاتی ہیں وہ قوا جسمانی کوشش و نفاذ دینے والی بہترین غذاؤں سے محروم ہو جاتی ہے، اس کے افراد نہ صرف جسمانی اعتبار سے کمزور بلکہ دماغی قوتوں کے لحاظ سے بھی ضعیف ہوتے ہیں، اور اس دوہرے ضعف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مغلوب و محکوم ہو کر رہتی ہے، اور آخر کار یا تو صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے یا دوسری طاقتور قوموں میں جذب ہو جاتی ہے۔

عقیدہ تناسخ کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ وہ تمدن و تہذیب کا دشمن ہے۔ اور انسان کو ہنسنا اور ترک دنیا کی طرف لیجاتا ہے۔ اہل تناسخ کا اعتقاد یہ ہے کہ روح کو جو چیر گناہوں سے آلودہ کرتی ہے وہ خواہش ہے۔ اسی کی بدولت روح کو بار بار جسمانی قابلوں میں آکر اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔ اگر انسان خواہشات کو پا مال کر دے اور اپنے آپ کو دنیا اور اس کے دھندوں میں نہ پھنسا تو اس کی روح کو آواگون کے چکر سے نجات مل سکتی ہے، اور نجات کی بس ہی ایک صورت ہے کیونکہ دنیوی زندگی کے معاملات میں پہننے کے بعد انسان کا خواہشات اور ان کے مقتضیات سے بچ جانا محال ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ نجات کے طالب ہوں وہ سنیا سی بن کر جنگلوں اور پہاڑوں

میں جا بیٹھیں۔ اور جو ایسا نہ کریں وہ نجات سے مایوس ہو کر جانوروں اور درختوں کے طبقات میں جانے کے لئے مستعد ہو جائیں۔ کیا یہ تخیل تمدن و تہذیب کی ترقی میں کسی طرح مددگار ہو سکتا ہے؟ اور کیا کوئی قوم یہ اعتقاد رکھ کر دنیا میں ترقی کر سکتی ہے؟

اس میں شک نہیں کہ بعض حیثیات سے تنازع کا اعتقاد کم از کم اس سے بہتر ہے کہ موت کو فائدے محض اور عدم مطلق سمجھا جائے۔ کیونکہ انسان میں بقائے دوام کی جو ایک فطری خواہش ہے وہ تنازع میں ایک حد تک تسکین پاسکتی ہے اور اس کے ساتھ اس عقیدہ میں جزا و سزا اور اعمال کے اچھے اور بُرے انجام کا جو تخیل موجود ہے اس کی بنا پر یہ ایک اچھے اور مضبوط اخلاقی قانون کے لئے پشت پناہ بھی بن سکتا ہے۔ لیکن اول تو یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے جس کی طرف ہم بار بار اشارہ کر چکے ہیں کہ جو عقیدہ عقل اور علم کے خلاف اور تمدن و تہذیب کی ترقی میں مانع و مزاحم ہو اسکی گرفت انسان کے دل و دماغ پر کبھی ایسی مضبوط نہیں ہو سکتی کہ وہ عقلی و عقلی ارتقاء کے ہر مرتبہ اور ترقی تہذیب و تمدن کے ہر مرحلے میں یکساں قوت کے ساتھ قائم رہ سکے۔ اور جب اسکی گرفت قائم ہی نہیں رہ سکتی تو اس عقیدہ کا محض کتابوں میں ایک فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت سے موجود رہنا نظام اخلاق کے بقا و استحکام کے لئے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو اسی صورت میں نافع ہوگا جبکہ وہ کتابوں کے بجائے دلوں میں متکون ہو اور لوگ پوری طرح اس پر اعتقاد رکھتے ہوں۔ دوسرے یہ عقیدہ اپنے آخری نتیجے کے اعتبار سے اپنی اخلاقی قیمت بھی کھودیتا ہے۔ کیونکہ جب کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ تنازع کا چکر بالکل ایک مشین کی طرح چل رہا ہے اور اس میں ہر فعل کا جو نتیجہ مقرر ہے وہ ظاہر ہو کر رہے گا؛ اور کسی توبہ و استغفار یا کفارے سے اس فعل کی تاثیر اور اس کے نتیجہ کو نہیں بدلا جاسکتا تو ایک دفعہ گناہ کرنے کے بعد ایسا شخص ہیشہ کے لئے گناہ کے پیر میں آجائیگا اور سمجھ لیگا کہ جب مجھے جانور یا درخت بنا ہی ہے تو کیوں نہ میں اس انسانی جون کی تمام لذتوں سے دل بھر کر فائدہ اٹھا لوں۔ (باقی)